جاؤں ۔ امی بھی خوش ہو جائیں گی اور اس بحرِ ذخار میں اپنی بے پتوار کشتی چھوڑنے سے بھی بچ جاؤں گی وہ شاید اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا لیتی ۔ لیکن اسی وقت سامنے والی سیٹ سے آواز آئی ۔

"کیوں بی اس طرح کھڑی رہو گی تو پنڈی جا کر سامان اترے گا ۔ ۔"

یہ خاتون کراچی سے آ رہی تھیں اور رشیدہ بہاولپور سے ان کی ہم سفر بنی تھی ۔ لیکن ابھی خیبر میل رودھراں تک نہ پہنچی تھی کہ وہ سامنے والی سیٹ سے اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھیں ۔ ان کے بیٹھنے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے نٹ بولٹ علیحدہ علیحدہ کر کے سائیکل ستری کے کھوکھے میں پڑی ہو ۔ ہر چیز ڈھیلی تھی ۔ ہر چیز غیر متعلقہ ۔

"اچھا پہلی بار لاہور جا رہی ہو تم ؟" پورے صوفے کی جگہ لیتے ہوئے انھوں نے پوچھا ۔

"جی ۔"

"کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا ؟"

"رشیدہ ۔ ۔ ۔ رشیدہ میر ۔"

"ذرا تکیہ پکڑانا اپنا ۔ میری تو کمر ٹوٹ گئی بیٹھے بیٹھے ۔ شکریہ ۔ لاہور میں کس کے پاس رہو گی ۔ والدین ہوں گے وہاں ۔"

"جی نہیں ۔" رشیدہ پیروں کو پائنچوں میں چھپاتے ہوئے بولی ۔

"پھر ؟ ۔ ۔ پھر کس کے پاس رہو گی وہاں ؟"

"میری خالہ ہیں جی وہاں ۔ ۔"

"اچھا ۔ ۔ کیا کام کرتے ہیں تمہارے خالو ؟"

"اینٹی کرپشن میں ہیں جی۔"

اب اس خاتون کے کان چونکیں جانور کی طرح متوجہ ہوئے۔

"میرا بیٹا واپڈا میں انجنیئر ہے۔ میں بھی کسی کے پاس جا رہی ہوں۔ اچھی طرح بیٹھو۔ کتنی کیوں جا رہی ہو؟"

یہ جملہ بولتے ہی انہوں نے اپنی ٹانگیں اور پسار دیں۔

ابھی گاڑی ملتان تک نہیں پہنچی تھی کہ واپڈا کے انجنیئر کی والدہ نے رشیدہ سے اس کے تمام کوائف معلوم کر لئے۔ باوجودیکہ کئی بار رشو نے اپنے آپ کو رسالے میں چھپانے کی کوشش کی لیکن کسی بڑے باتونی خلیفے کی طرح وہ ہر بار اسے باتوں میں لگا لیتیں۔ رشیدہ کے متعلق ان کی تمام معلومات مکمل ہو چکی تھیں۔ اب اگر وہ چاہتیں تو بغیر رشو سے پوچھے اس کے پاسپورٹ کی غرض سے سی آئی ڈی رپورٹ کے داغ سکتی تھیں۔

"سائیکلوجی کا ایم اے کرنے کے بعد کیا ارادہ ہے تمہارا؟"

"فی الحال تو کوئی ارادہ نہیں جی۔ ابھی تو دو سال ایم اے کرتے ہی لگیں گے۔"

"کہیں منگنی وگنی ہوئی ہے تمہاری؟"

پتہ نہیں حلق کے اندر رشو کے ریگمال لگا ہوا تھا کہ آواز گھستی رگڑکھاتی نکلی۔

"جی نہیں۔"

والدہ انجنیئر نے ابرو اٹھائے۔ تیزی سے دوڑتے درختوں کے ساتھ ساتھ بھاگتے بجلی کے کھمبوں پر رشو نے نظر ڈالی۔ اور سوچنے لگی۔ بالکل اسی طرح تیزی سے زندگی کے اٹھارہ سال گذر گئے۔ اکنومکس اور سائیکلوجی کے ساتھ بی اے بھی ہو گیا۔ لیکن پچھلے دو سال جب

وہ گھر بیٹھ کر اپنے ہونے والے دولہا کا انتظار کرنے لگی تو وقت اس طرح گذرنے لگا جیسے ریت میں دھنسے ہوئے پہیے۔ امّی روز اسے تسلی دینے کے لئے اونچی آواز میں اپنے آپ سے کہا کرتی تھیں۔

"رشو جان کا رشتہ ہمیں یہاں بیٹھے بٹھائے آئے گا۔ شادی تو نصیب سے ہوتی ہے جہاں لکھی ہوتی ہے وہیں ہوتی ہے۔ دولہا سات سمندر پار سے آئے چاہے ساتھ والے گاؤں سے ... آپی آپ آجاتا ہے ... پچھمی ہواؤں کی طرح ..."

پورے دو سال اس آپی آپ آنے والے دولہا کے انتظار میں رشو جان نے کاٹ دیئے۔ کسی سے جوان بیٹی کے رشتے کے لئے کچھ کہتے امّی کا حلق بند ہوتا تھا۔ ادھر رشیدہ گھر کی صفائیاں کر کر کے تھک چکی تھی۔ ہر صبح بستر بچھاتے۔ گلدانوں میں پھول سجاتے۔ دریاں جھاڑتے۔ تخت پوش کے گاؤ تکیے ٹھکانے سے لگاتے ہوئے اس کے دل میں آنے والے دولہا کے قدموں کی چاپ اٹھتی۔ دل ایک نجانے اضطراب سے کانپتا۔ ہر نئی آواز، ہر نئی دستک پر امید کی لو ابھرتی، اور دل میں ایک نجانی سی خوشی جھل جھل کرکے بھر جاتی۔ چھوٹے چھوٹے کاموں میں شام آجاتی۔ امّی مغرب کی نماز کے لئے چٹائی بچھا لیتیں اور ساتھ والے گھر سے یکدم چڑیوں کے جھنڈ شب بخیر شب بخیر کہتے رخصت ہوتے تو وہ کوٹھے پر چڑھ جاتی۔ شہ نشین پر بیٹھ کر وہ دور تک گلی میں دیکھتی رہتی۔ دن بھر کی خوشیوں کا اسقاط ہو جاتا۔ اسکی ہمت کے ٹانکے ٹوٹ جاتے۔ جب نیا چاند آسمان پر نظر آتا تو رشو دعا کے ہاتھ اٹھاتی۔ اس کی پلکوں پر آنسو آجاتے۔ اور وہ آپی آپ آنیوالے دولہا سے کہتی۔

"کب تک راہ دکھلاؤ گے؟ ... کب آؤ گے؟ اگر میں تمہیں تلاش کرنے نکلوں تو کیا پتہ پوچھ کر

تمہارا مکان تلاش کروں؟"

جب ہر صبح گھر صاف کرنے اور ہر شام دولہا میاں کی راہ تکتے تکتے رشو جان تھک گئی تو اچانک ایک دن اس نے ایم اے سائیکلوجی میں داخلہ لینے کا تہیہ کر لیا۔ اماں اس بات کے بہت خلاف تھیں۔

"میں تمہیں لاہور نہیں بھیج سکتی۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔"

رشو جان نے کاغجی جابا کہ چلا کر پوچھے: "یہ بتایئے آپ سے کیا ہوگا؟ ۔ ۔ ۔ کیا آپ مجھے وہ کائی سمجھتی ہیں جو متعفن تالاب کی سطح پر آپی آپ سڑ جاتی ہے؟ میں یوں کاہل مجہول ہو کر نہیں بیٹھ سکتی۔ میں بھنبھیری ہوں لیکن جاندار ہوں۔ پر رکھتی ہوں۔ مجھ سے یہ کولہو کے بیل کی سی زندگی بسر نہ ہوگی۔"

پہلے تو رشو جان نے دبی دبی زبان میں اپنی تمنا ظاہر کی۔ پھر ایک دن پاکستان ٹائمز میں داخلے کا اشتہار پڑھ کر ایک درخواست چوری سے داغ دی۔ جب تک ادھر سے جواب آیا۔ رشو جان نے مہارانی لنگیتی کی طرح اٹوانی کھٹوانی لے کر بہت کچھ ماں کو رام کر لیا تھا۔ لیکن یونیورسٹی سے جب جواب آیا تو رشیدہ کی حالت غیر ہوگئی۔ انٹرویو کے لئے بھی اسے نہ بلایا گیا تھا۔ صرف اتنی سی امید دلائی گئی تھی کہ اگر طلبہ میں سے کوئی گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد نہ پہنچا تو اسے اطلاع دے دی جائے گی۔ رو رو کر رشو نے آنکھیں لال بھبوکا کر لیں۔ رشو تو شاید ابھی بہت دیر تک سماوار کی طرح اندر ہی اندر کھولتی رہتی۔ لیکن اچانک ایک دن سرکاری خاکی لفافہ آگیا۔ ایک طالبہ سائیکلوجی کے ایم اے میں داخلہ لینے کے بعد حاضری دینے نہ پہنچی تھی۔ سیٹ خالی تھی۔ رشو نے اماں کو بتائے بغیر سارا سامان باندھا۔ اندر ہی اندر نیز گام کے اوقات بھی معلوم کر لئے۔ مشکل یہ تھی کہ لاہور پہنچ کر رہے گی کہاں؟

امّی نے اجازت دینے میں کچھ حیل و حجت ضرور کی۔ لیکن بالآخر وہ یہ سوچ کر جان گئیں کہ شاید ابھی آنے والے دولہا کا وقت معیّن نہیں ہوا۔ کیوں جوان لڑکی بیکار بیٹھی رہے؟۔ رشیدہ کو بھیجنے میں جو عذرِ ضعیف تھا وہ یہی تھا کہ رشو وہاں جاکر رہے گی کہاں؟

"امّی میں کسی ہوسٹل میں رہ لونگی؟"

"توبہ۔ توبہ۔۔۔ ہوسٹل کی لڑکیاں آوارہ ہو جاتی ہیں۔"

ہوسٹل کا نمبر کٹ گیا تو اب ان رشتہ داروں کی فہرست بننے لگی جو لاہور میں رہتے تھے۔ چچا دارث سے لیکر خالہ فیروزہ تک سب کے گھروں کی تفسیر کی گئی۔ بدقسمتی سے رشو کے چھوٹے سے کنبے کا رشتہ باقی برادری سے کبھی کا کٹ چکا تھا۔ شادی بیاہ میں کارڈ وغیرہ ضرور آجاتے تھے لیکن نہ ادھر سے جانے کی استطاعت تھی نہ ادھر سے کبھی اصرار ہی ہوا تھا۔ جب سے رشو نے ہوش سنبھالا تھا، لاہور والے رشتہ دار نہایت دور، بے حد پراسرار اور بہت ہی مختار کل تھے۔ ان کی جو بھی خبر بہاولپور پہنچتی سنہری حروف میں لکھوا کر فریم کر کے دلوں میں ٹنکائی جاتی۔ لاہور والے ہر طرح سے ارفع و اعلیٰ تھے۔ رشیدہ کا ننھا سا کنبہ کسی طرح بھی ان کی ریس نہ کر سکتا تھا۔ اگر کوئی لاہور سے کبھی ٹپکتا، تو اس کے لیے مرغن پلاؤ، قورمہ، کوفتے انگلی انگلی گھی میں تیرتے پکائے جاتے۔ امّی کے جہیز کی پلیش کی رضائیاں نکلتیں۔ کڑھی ہوئی چادریں بچھائی جاتیں۔ گھر میں سے اگربتیوں کی خوشبو آتی۔ اور پہلی ہی شام مہمان کو نواب صاحب کا محل دکھانے کا پروگرام بنتا۔ سب سے زیادہ تردّد امّی نے خالہ فیروزہ کے دورانِ قیام میں کیا تھا۔ اسی مہمان نوازی کے بھروسے انہوں نے رشو کے قیام کے لیے ان ہی کا انتخاب کیا۔

"کیا بات ہے باہر کیا دیکھ رہی ہو۔" انجینئر کی والدہ نے اسے غیر حاضر پا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں جی۔ ایسے ہی۔"

انجینئر کی والدہ نے دانتوں میں خلال پھیرتے ہوئے کہا۔

"میری بڑی بیٹی کی شادی سولہ برس کی عمر میں ہو گئی تھی۔ مسٹر کالڑا کا ہے میرا داماد۔ شادی چھوٹی عمر میں ہونی چاہیے۔"

"جی!"

"کوئی سٹیشن پر لینے آئے گا نہیں؟"

"جی خالہ کو تار دیا ہوا ہے۔ ۔ ۔"

"اچھا اچھا۔"

سامان اتروا کر جب رشیدہ باہر پلیٹ فارم پر پہنچی تو اسے پختہ یقین ہو گیا کہ خالہ کے گھر سے جو بھی اسے لینے آیا ہو گا تین گھنٹے کی صبر آزما مدت گزار کر جا چکا ہو گا۔

نمبر لگے ہوئے قلی نے باہر نکلتے ہی پوچھا۔

"ٹیکسی منگواؤں بی بی جی؟"

"نہیں۔ ابھی نہیں۔"

باہر لمبے برآمدے میں پہنچ کر وہ پہلے سے زیادہ متذبذب ہو گئی۔

ایک رکشا والا رفتار کم کر کے اس کے پاس سے گزر گیا۔ لیکن وہ ابھی تک فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ ملتان روڈ کس طرف ہے اور وہ بیلی روڈ کیسے پہنچ پائے گی۔

گاڑی تین گھنٹے لیٹ ہو جانے کے باعث اندھیرا بہت گہرا ہو چکا تھا۔ اور ایک اجنبی شہر کے اجنبی اندھیرے سے وہ بہت خوفزدہ ہو رہی تھی۔

قلی کو پیسے دیکر رخصت کر چکنے کے بعد وہ اور مخمصے میں پھنس گئی۔ اب اگر خالہ کے گھر سے کوئی آیا بھی ہے تو اسے تلاش کرنے کہاں جاؤں؟ سامان کس کے حوالے چھوڑ کر جاؤں؟ قریب ہی دو نوجوان کھڑے بظاہر جمائیاں لے رہے تھے لیکن ان کی نظریں بار بار ادھر کا طواف کر رہی تھیں۔ مارے خوف کے رشیدہ کے ہاتھوں میں ہلکا ہلکا پسینہ آنے لگا۔

انجنیئر کی والدہ نے مجسب پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ تو وہ بندریا کی طرح اچھلی

"ارے ڈر گئیں۔۔۔ میرا بیٹا بھی نہیں آیا مجھے لینے۔۔۔ تمہاری خالہ بھی نہیں پہنچیں۔۔۔"

"جی ہاں۔۔"

"ساری بدبختی اس لیٹ گاڑی کی وجہ سے ہے۔ چلو! ٹیکسی لے لیں۔ مجھے سمن آباد جانا ہے۔"

"جی؟"

"تم راستے میں مغلپورہ روڈ اتر جانا۔ ایک ہی تو راستہ ہے۔ میں ملتان روڈ کی طرف سے چلی جاؤں گی سمن آباد۔"

"جی ہاں! ایک ہی راستہ ہے۔ میں کچھ اور سوچ رہی تھی۔"

رشیدہ کے لئے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ انجنیئر صاحب کی والدہ کے ساتھ ٹیکسی میں

سوار ہو گئی۔ ایک اجنبی عورت کے ساتھ بند ٹیکسی میں رات کے وقت سفر کرنا بذات خود رشو کے لئے ایک عجیب سی بات تھی۔ پھر وہ خاتون شکل و صورت سے انجنیئر کی والدہ نہیں بلکہ بڑھی نائیکہ لگتی تھی۔ رشیدہ کھسکتی کھسکتی بالکل دروازے کے قریب جا لگی۔ نائیکہ صورت عورت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"بیٹی یوں لگتا ہے جیسے تم پہلی بار لاہور آئی ہو۔"

دکھ اور خوف اس کے حلق میں برسات کے مینڈک کی طرح گلپھڑے پھلائے بیٹھے تھے۔

اس نے تیزی سے دائیں بائیں سر ہلایا اور اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا۔ لیکن ہاتھ پر اجنبی عورت کی گرفت فولادی تھی۔

"میں بھی بڑی چھوٹی عمر میں یہاں آئی تھی۔ پانچویں تک تعلیم تھی میری۔ مجھ کو تو ساری تعلیم اسی شہر نے دی۔ یہ میکلوڈ روڈ ہے۔ دیکھ لو۔ سارے سینما یہیں ہیں تقریباً۔"

رشیدہ نے آنکھیں باہر کو پھیر دیں۔ ٹیکسی فراٹے بھرتی رواں تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کچھ اس طرح سامنے والا شیشہ فٹ کر رکھا تھا کہ اگر رشو نظر اٹھا کر سامنے دیکھتی تو ڈرائیور کی نظریں اس کے آر پار ہو جاتیں۔

سینما گھروں کے سامنے اب رش کم تھا۔ لیکن بتیوں کی جگمگاہٹ اور بڑے بڑے سائن بورڈوں کی روشنی آنکھیں چندھیا رہی تھی۔ صبیحہ، نیلو، بہار، شیریں کی بڑی بڑی شبیہیں خوبصورت جادوگرنیوں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔

فلمی سائن بورڈ پر بنائی ہوئی تصویریں ایک سی تھیں۔ ایکٹرسوں کے بھرے بھرے سرخ

ہونٹ، گالوں تک آیا ہوا ایک آدھ آنسو، قوالی کے انداز میں اٹھے ہوئے ہاتھ، ٹھہر و رک جاؤ پکارتا ہوا ہیرو، بھر رکے سے جھانکتی ہوئی آنکھیں، مغلئی محراب میں چوڑی دار پائجامہ، اور پشواز پہنے گود میں دودھ پیتا بچہ لئے، کسی کے گناہ کو چھپائے قربانی کی دیوی، بوڑھی ایکٹریسوں کی شبیہیں جو اب ماں بننے پر مجبور تھیں۔ نوجوان ہیروئین کے تھل تھل جسم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شکلیں لاد کر آگ بجھانے جا رہے ہیں۔ ولین جس کی آنکھ پر چمڑے کی اندھیاری تھی، جو ہالی وڈ کی ویسٹرن فلموں کی طرح چمڑے کی جیکٹ، جینز، اور لٹکے ہوئے بیلٹ پہنے تھے۔۔۔ یہ سارے ساتن بورڈ رنگ و نور کا گلال بکھیرے اسے بلا رہے تھے۔ سارے لاہور کا گلیمر اس کے استقبال کے لئے بڑھا آ رہا تھا۔

"کونسا نمبر بنایا تھا تم نے؟" فزلادی شکنجے نے اسے جھنجھوڑ کر پوچھا۔

رشو نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چٹ انہیں تھما دی۔

روکو! بھئی! ٹیکسی روکو۔۔۔"

اور ٹیکسی جیسے چیخ مار کر رک گئی۔

ٹیکسی کے دو روپے چالیس پیسے ادا کر کے جب وہ پھاٹک تک پہنچی تو اس کا دل دھک دھک بج رہا تھا۔

. . . .

آج اتوار تھا۔۔

دراصل کو خالہ سے سلام دعا کی بوہنی ہوئی تھی۔ مگر دوسرے تھانیدار کو پاکر بستروں میں

جا چکے تھے۔ رشیدہ سے خالہ نے تین چار جملوں میں بہاولپور والوں کی خیریت پوچھی اور پھر انور ہی کے ساتھ اسے بھیج دیا۔

رشیدہ کو جو کمرہ تفویض کیا گیا تھا وہ باکس روم سے ملحق تھا۔ سامنے گیلری تھی۔ اور جب بھی دروازہ کھلا ہوتا تو سامنے نقش کا تدریجہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ پچھلی کھڑکی کے کھلنے پر آنگن، باورچی خانہ، مرغیوں کا ڈربہ، نوکروں کے کمرے اور اناج کی کوٹھڑی نظر آتی تھی۔

انوار ہونے کے باوجود رشید کی آنکھ بہت صبح کھل گئی تھی۔ اس نے جب کمرے کا دروازہ کھولا تو سارے گھر پر نیند کا غلبہ تھا۔ حتیٰ کہ باورچی خانے میں بھی کسی قسم کا کھڑکا دڑکا نہ تھا۔ نماز پڑھ چکنے کے بعد اس نے اپنے کمرے کا پھیرا جائزہ لیا۔ دیوار گیروں پر گرد سے اٹے ہوئے بھاری برتن، ساگوان کی لکڑی سے بنی ہوئی الماری، ایک کرسی، اور ایک چارپائی جس پر وہ رات سوئی تھی۔ رشیدہ کو اپنی بے مائگی اور بے سروسامانی پر ترس آگیا۔ اپنے سامان سے اس نے آہستہ سے کاپی نکالی اور امی کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔

پیاری امی جان:

السلام علیکم۔

میں بخیر و عافیت ہوں اور خالہ فیروزہ کے گھر پہنچ گئی ہوں۔ رات کو چونکہ ٹرین تین گھنٹے لیٹ تھی۔ اس لئے خالہ فیروزہ پلیٹ فارم پر دو گھنٹے راہ دیکھ کر گھر لوٹ گئیں۔ یہ جھوٹ اس نے ماں کی تشفی کے لئے رقم کیا تھا لیکن میری ایک ہم سفر خاتون مجھے گھر پہنچا کر گئیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ رات چونکہ دیر ہو گئی تھی اس لئے خالہ سے تفصیلی باتیں نہیں ہو سکیں۔

میرا گھر علیحدہ ہے۔ مجھے پڑھائی کرنے میں آسانی رہے گی۔ خالہ زہرا نے بہت
آراستہ کر رکھا ہے۔ آپ کسی قسم کا فکر نہ کریں۔

ہمیشہ آپ کی تابعدار

"رشّو"

نوٹ:۔ زری، خالد، اور راشدہ کو پیار۔ طاہرہ باجی نے میری قمیض بھجوائی تھی کہ نہیں؟

یہ خط رقم کرنے کے بعد جب اس نے آنگن میں نظر کی تو ستمبر کی دھوپ صبح کو جگانے آنگن میں آ گئی تھی۔ رمضان کیتلی میں پانی بھر کر باورچی خانے کی طرف جا رہا تھا۔ انوری البتہ نئی صبح عجیب سے کام میں مشغول تھی۔ وہ مرغیوں کے ڈربے کے پاس بیٹھی چھاج سے گیہوں پھٹک رہی تھی۔ ۔ ۔ اتنی صبح گیہوں پھٹکنے کی وجہ رشو کو سمجھ نہ آئی۔ لیکن وہ کھڑکی میں کھڑے انوری کو دیکھنے لگی۔

انوری نوکرانی تھی، لیکن کچی عمر کا ٹھاٹھ! سرکس کے جوکر جیسی ہنسی! جسم آڑو کے شگوفوں کی طرح بھرا بھرا، اور لچکیلا۔ ہر بار جب وہ رولی کو ایک طرف پھٹک کر اتارتی تو اس کے گندم گوں بازو صندل کے سیرو لگتے۔ انوری کی نگاہیں بار بار آنگن میں روند کو نکلتیں۔ جیسے یہ بھانپ رہی ہوں کہ گھر میں کون کون جاگا ہے۔

رمضان نے کیتلی کو تیل کے چولہے پر چڑھا کر، پھر کھری چارپائی پہ آ لیٹا تھا۔ اور بازو کو آنکھوں پہ رکھے پڑا تھا۔

انوری نے جب خوب تسلی کر لی کہ ابھی کوٹھی والے محوِ خواب ہیں اور شاگرد پیشہ

میں سے کوئی بھی موجود نہیں تو اس نے یکبارگردن اٹھا پنجوں کے بل اچک کر کوٹھی کی جانب لمبی سی نگاہ ڈالی، پھر وہ دبے پاؤں گھڑوں تک پہنچی، چھینی پر تھوڑا سا پانی چھلکایا اور اس مدہ کے پیالے کو ہے راجہ زٹل کی طرح رمضان کی چارپائی کے پاس پہنچی۔

جانے یہ نیند تھی کہ وہ بھی آنکھیں موندے جھری سے انوری کو تک رہا تھا، پر چتون سے ظاہر ہوتا تھا جیسے گہری نیند سو رہا ہے۔

اس چپر قناتیہ نے انوری کی آمد پر تولہ بھر جنبش نہ کی، ادھر پر تولتی بلبل نے چھینی کا پانی اس پر یوں اچھالا، جیسے مہذب محفل میں نکاح کے چھوہارے، پانی کا پڑنا تھا کہ رمضان ککرمتے کی طرح اٹھ بیٹھا۔ ادھر انوری قلقل قہقہہ مارتی زقند بھرتی، چوٹی کا سپنولیا لہراتی، ایسی بھاگی کہ بیچارہ رمضان انگوروں کی طرح منہ تکتا رہ گیا

جب تنویر باجی آپا جی کے لئے بیڈ ٹی لینے آئیں تو جوڑی نمازی قنگل مارے انوری گندم پھٹک رہی تھی اور رمضان ترازو اخفش بنا پاس کھڑا تھا۔

تنویر باجی کو دیکھتے ہی انوری چلائی۔

”باجی جی! دیکھ لو جی، ، کب سے کہہ رہی ہوں اسے چائے بنانے کو، صاحب کے لئے بیڈ ٹی کو دیر ہو جائے گی، اسے پروا ہی نہیں . . . کھڑا جمائیاں لے رہا ہے۔ بیگم صاحبہ سے کہیئے اسے سیکنڈ شو نہ دیکھنے دیا کریں“

”پانی تو کبھی کا دھرا ہے چولہے پر۔۔“ رمضان جاتے ہوئے بولا۔

”چولہے پر دھرنے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ چائے بن جائے گی، ہاں!“ انوری تنک کر

بولی: "مجھے تو بیگم صاحب نے کہا تھا کہ صبح نو بجے سے پہلے آدھی بوری گندم کی صاف کر لینا۔ میں تو منہ اندھیرے سے لگی ہوں۔ دیکھ لو۔"

تنویر باجی بیٹھک کے متعلق ہدایات دے کر واپس چلی گئیں۔ اور انور، رمضان کی طرف دیکھ کر سرکس کے جوکر کی طرح ہنسنے لگی۔

رشو جان کچھ بھولے سے بہانے نہ تھی کہ شہزادہ گلفام کی طرح چھوڑ دے ہزاروں کی نیکی بدی کا علم نہ ہو سکتا۔ بی اے تک تعلیم تھی۔ سائیکلوجی جیسا مضمون پڑھا تھا۔ باتیں تو سبھی معلوم تھیں۔ لیکن باتیں معلوم ہونے کا یہ مطلب نہ تھا کہ ان پر ایمان بھی آگیا تھا۔ تھیوری اور تجربے میں جو فرق ہے وہی رشو کی تعلیم اور سادہ زندگی میں نمایاں تھا۔ غم کے جو چھینٹے رشو جان ذہن پر لادے پھرتی تھی۔ بہاولپور میں نہ تو ان کے بطلان کی کوئی وجہ موجود تھی۔ نہ ان پہ ایمان لانے کی کوئی دلیل۔ لاہور کیا پہنچی کہ دل میں بخارے پڑ گئے۔ تیغا توڑ کر جیسے کسی نے علم کی ساری کوٹھڑیا ہی مسمار کر دی۔

فاختہ کے دل کی طرح دھڑکتی، گھڑیاں گھڑیاں وہ بار بار سوچ رہی تھی۔ امی کے متعلق زری، خالد، اور راشدہ کے متعلق۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی تو اس کی تسلی کا اہل نہ تھا۔

سب گھر میں اٹھ گئے ہوں گے۔ ہتھی سے چلنے والے نلکے کے سامنے سب نے وضو کیا ہوگا۔ زری چھوٹے چھوٹے گیلے پیروں سے جانماز پر بیٹھی کبھی راشدہ، کبھی امی کا منہ تکتی ہوگی۔ لیکن اب تو سورج نکل آیا ہے۔ . . وہ لوگ تو کبھی کے اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے ہوں گے۔ خالد پلاسٹک کا بیگ لے کر اباجی کی سائیکل پر سبزی گوشت لینے گیا ہوگا۔ اس کے پیر سائیکل

کے پیڈلوں پر پچھا حصہ جمے نہیں رہتے۔ جب گولائی میں پیڈل نیچے چلے جاتے ہیں تو اس کے پیچھے پٹیوں سے اٹھ جاتے ہیں۔ پھر وہ زور لگا کر جیسے پینگ مارتے ہوئے پیڈلوں کو پیروں کے قبضے میں لاتا ہے۔

اور جو کسی دن خالد بازار سے نہ لوٹا اور اس کے پاؤں پیڈل تک نہ پہنچ سکے۔ اور کوئی ٹرک ریتوں سے لدا سامنے سے آگیا تو۔۔۔۔۔۔! ۔۔۔۔۔۔ ایسا ٹرک جس کے ماتھے پر "اللہ نگہبان" لکھا ہوتا ہے تو کیا ہوگا؟ ۔۔۔ اگر کسی ایسے ٹرک کے سامنے آکر خالد کو پیڈل نہ ملے تو؟ رمضو نے سر جھٹکا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

انوری نے پھر چھاج پکڑ لیا تھا۔ اور رہتی رد کی گندم پھٹکنے لگی تھی۔

رمضان بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ شیشوں والا کرتا، چاندی کے بٹن، اور ریشمی رومال؛ یہ سب کچھ اپنے بیاہ سنجوگ کے لیے تھوڑا تھا۔ اتنے چھبیلا بننے کی وجہ فقط ایک ہی تھی کہ ان کپڑوں کی سائی دے کر وہ چوکڑی بھرتی ہرنی کو زیر دام لانا چاہتا تھا۔

جب چھینی سے پانی اس پر گرا تو جیسے ساری اجڑی تنخواہ وصول ہو گئی۔

تنویر باجی یونہی آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔ اس نے لوٹا بھر پانی بھرا اور کھلے دروازے کی اوٹ میں باورچی خانے کے پاس جا کھڑا ہوا۔

اندر پانی سوں سوں کر رہا تھا۔ انوری نے بڑی اتراہٹ سے بغیر پیچھے دیکھے کہا۔

"پانی پکنے لگا ہے رمضان!"

رمضان نے خاموش گھات میں بیٹھا تھا۔ جب انوری نے محسوس کیا کہ باورچی خانے

میں کوئی موجود نہیں اور پانی جوش کھا چکا ہے تو وہ چھاج کو گندم کے ڈھیر پر اچھال کر خوب اترائی باورچی خانے کی طرف چلی۔

ابھی اسے اندر گھسے دو منٹ ہوئے تھے کہ رمضان خالی لوٹا ہاتھ میں لئے لپکتا ہوا باہر نکلا اور بیت الخلا کی طرف چلدیا۔

جب رمضان کا بدلا اتارنے انوری بالٹی بھر پانی لئے باہر نکلی تو سامنے سے خالہ فیروزہ کمر پر لگی ہوئی زپ بند کرتی آرہی تھیں۔

"کیوں بھئی چائے تیار نہیں ہوئی ابھی؟"

"بس جی پانی کھولنے والا ہے۔ ابھی تیار ہو جاتی ہے۔"

"آغا جی کے لئے بیڈ ٹی لے آنا۔"

"اچھا۔ بیگم صاحبہ!"

یکدم فیروزہ خالہ کی نظر انوری کے گیلے کپڑوں پر جو گئی تو وہ جھٹ سے بولیں۔

"ارے انوری یہ کپڑے کیسے گیلے ہو گئے تمہارے؟"

انوری نے اپنے چپکے ہوئے کپڑوں پر نگاہ ڈال کر کہا۔

"خدا قسم بیگم صاحب! آپ اس موئے رمضان کو کچھ نہیں کہتیں۔ سارے گھر میں اتنی کیچ مچی ہے۔ میں یہ بالٹی پانی کی بھرنے لگی تو سارا گھڑا پھسل آیا مجھ پر۔"

"تم گھڑے صاف کر لیا کرو۔ انوری۔۔۔" بیگم صاحبہ نے حکم دیا۔

"اچھا جی۔ میں ہی صاف کر لیا کروں گی۔ اس بدبخت کے تو ہاتھ ٹوٹتے ہیں کام کرتے۔"

فیادرزہ، خالہ جمائی لیتی، کہنی کھجاتی اندر چلی گئیں۔

انوری نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں اور پھر باورچی خانے میں غائب ہو گئی

رشو جانے پر نجانے اس واقعے کا اس قدر شدید اثر کیوں ہوا؟ کچھ تو ماضی کی زندگی میں ایسے واقعات کم گذرے تھے۔ کچھ صبح کا وقت ایسا تھا کہ اس کے کانوں میں ابھی تک تلاوت کرتی امی کی آواز گونج رہی تھی۔ بے چاری منہ کے بل بستر پر جا لیٹی۔

حجرے میں سوچنے لگی۔ بہاولپور میں کیا معاشقے نہیں ہوتے؟ وہاں کیا لڑکیاں چیڑ الاکھ جیسے سرخ ہونٹ لٹکا کر نہیں چلتیں؟ کیا وہاں مرد اور عورتیں حد فاصل الانگ کر ایک دوسرے کے قریب نہیں جاتے؟ پھر یہاں آ کر ایسی بات دیکھتے ہی اس کا دل کیوں پھٹنے لگا ہے۔

ساری بات تو یہ تھی کہ بڑھے دریا اور ٹدیارے نالے کے درمیان جو دنیا آباد تھی سارے شہروں کی خلقت پر مستزاد تھی۔

عام آبادی کی ایک شہ رگ ہوتی ہے۔ اس شہر کی شہ رگیں بھی دو تھیں۔ ایک جو لہو کی گردش کے لئے مخصوص تھی۔ اور ایک وہ جس میں احساس برتری کا ناگ پھن اٹھائے پھرتا تھا۔ یہ اس شہر کے لوگوں کو زیادہ عزیز تھی۔ شاید لہو کی گردش بند ہونے پر وہ زندہ رہ سکتے تھے لیکن احساس برتری کے بغیر انہیں پل بھر بھی سانس لینا دشوار ہو جاتا۔

نقل ہے کہ کسی گنجان جنگل میں ایک شیر رہتا تھا۔ جنگل کا یہ عالم تھا کہ درخت صف درصف، بیلیں الجھی ہوئیں، ریشیوں کی طرح پیوستہ، اور جھاڑ سر سے سر جوڑے کھڑے تھے۔ دوپہر کے وقت سورج کی کرنیں اس کچھار تک نہ پہنچ پاتی تھیں جہاں شیر استراحت کیا کرتا تھا۔

اس شیر دلیر رستم صفت کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ چھوٹے بڑے جانوروں کا دل ہر لحظہ بوکھلایا رہتا تھا۔ ایک نر بچہ مرحوم شیرنی کی نشانی موجود تھا کہ شیر اس کو دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ اور بن ماں کے بچے کی خود پرداخت میں کسی شے کی کوتاہی نہ کرتا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت کا خیال اسقدر غالب تھا کہ شیر بچے کو لیکر سارے جنگل کی چھان بین کو نکلا۔ اور بالآخر بچہ کو اس کی اتالیقی سونپ کر نچنت ہو بیٹھا۔

بندر جیسے جانوروں کے بیچ نظارہ کے بغیر چھوڑ کر روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ بھالو کی تقرری اور تقرب کو دیکھ کر از بسکہ جلا۔ شیر کی کچھار کے پاس پھٹکنے کی ہمت نہ تھی۔ اور دریا میں مشغول تھی کہ کسی طرح بھالو کی جگہ ہتھیانے کی ہو دل کی بھڑاس نکلے۔ اسی فکر میں دن رات پھرتا۔ ڈالی ڈالی پھاندتا۔ ہر جانور کے سامنے گھگیاتا۔ بالآخر ارکان دولت میں سے کسی کو گانٹھ کر شیر کی خدمت میں سرفراز ہوا۔ طریقہ خدمت کا بجا لاتا تھا۔ اور اپنی مسخری حرکتوں سے دل شیر کا بہلاتا تھا۔ اپنی چاپلوسی اور کفش برداری کے باعث بہت جلد شیر کی صحبت میں ممتاز ہو گیا۔

ایک دن باتوں باتوں میں کہنے لگا کہ، اے عالی مرتبت جنگل کے شاہ! سلامتی و شادمانی تیرے قدم چومے۔ تیری ہیبت سے چرند پرند کانپیں۔ اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں۔ شیر نے لمبی جمائی لی اور بولا . . . پوچھ۔ کیا پوچھتا ہے؟ بندر نے زمین بوسی کے بعد دریافت کیا کہ اے آقائے دلی نعمت یہ بتا کہ تو نے وہ کونسی خوبی ریچھ میں دیکھی کہ شہزادہ والا تبار کی اتالیقی سے اسے نجابت بخشی۔ اور اس تلطف سے پیش آیا کہ اس شہد خور میں نہ حسن ظاہری نہ اعلیٰ نسبی نہ کوئی دوسرا وصف لائق توصیف ہے۔ شاہ نے پتھر پر پنجہ مار کر کہا کہ درخت پر چڑھنا گر ہمارے

اوصاف میں شامل نہیں۔ لیکن بھالو اس میں خوب خوب مہارت رکھتا ہے۔ سو ہم نے اپنے نورِ چشم کو اس کے سپرد کیا ہے کہ ہر طرح سے صاحبِ کمال ہو۔ بندر کچھ دیر کلکتا رہا، پھر جیبھ گال میں گول کرتے ہوئے بولا۔ "۔۔ شہنشاہ جم جاہ! تیری جوتیوں کے صدقے۔ درختوں کو پھاندنا اور ٹہنیوں پر چڑھنا اترنا یا تو بندر کو آتا ہے یا گلہری کو . . . اگر یہ ایسی خوبی بھالو کو شہزادہ ذیجاہ کی تربیت کا ضامن کیا ہے تو کچھ اچھا نہیں کیا۔ شیر نے لمبی سی جمائی لی اور مسکرا کر بولا۔ بوزنے! تیرا کہنا تو ٹھیک ہے۔ لیکن شہزادوں کی تربیت میں فقط گُر کا فرق ہوتا ہے۔ تجھ میں اور اتالیقِ بلند مرتبت میں فقط ایک فرق ہے۔ تو منہ کے بل درخت سے اترتا ہے اور ریچھ سرین کے بل . . . ہمارے جنگل کے درندے بھالو کے اس وصف سے نا آشنا ہیں۔ سو ہم نے اسے اسی خوبی کے باعث منتخب کیا۔

لاہور میں بھی بھالو کی سی خوبی تھی۔ ساری دنیا جہاں منہ کے بل اپنے گُن اور کرتب کا اظہار کرتی۔ وہاں لاہور والے منہ میں کوکا کولا کی بوتل لئے سرین کے بل اپنی برتری کا اظہار کرتے تھے۔

رشّو باجی نے بھی بھالو کو دیکھتے ہی زانوئے تلمذ تہ کیا اور پچھلی پڑھی بالی جی سے بھلا کر از سرِ نو مکتب میں داخل ہو گئی۔

جس وقت الوری نے اس کے کمرے پر دستک دی تو گھڑی نو بجا رہی تھی۔ ستمبر کی دھوپ سارے آنگن پر پھیلی تھی۔ یکدم اس نے حیران ہو کر ارد گرد دیکھا۔ یوں صبح سویرے سونے کی تو وہ عادی نہ تھی۔ پھر آج کیا ہوا؟ آج اس کی آنکھ کیسے لگ گئی۔

"آپا جی! ناشتہ کر لیں جی۔۔" انوری نے پٹ کے ساتھ منہ جوڑ کر آواز دی "سب انتظار کر رہے ہیں۔"

"آ رہی ہوں۔ ایک لمحہ میں۔"

سر کو دوپٹہ سے ڈھانپتی وہ باہر نکلی۔ تو سب سے پہلے گیلری میں انوری نظر پڑی۔ وہ ہاتھ میں جھاڑن لئے کھڑی تھی۔

"اللہ! رشو آپا تین بار آپکو چائے کے لئے بلانے آئی ہوں۔ ان جی! آپ تو مردوں سے شرط باندھ کر سوئی ہیں۔"

رشو نے حیران ہو کر انوری کی جانب دیکھا۔ اور سوچنے لگی۔ بھلا اس کو میرا نام کیونکر معلوم ہوا۔

"میں تو صبح سویرے اٹھنے کی عادی ہوں۔"

انوری نے اپنے بھرے سے ہونٹ کھولے اور خوب ہنس کر بولی۔

"ہائے اللہ! یہ صبح ہے آپا جی دیکھئے تو سہی۔"

بات بالکل معمولی تھی۔ لیکن رشو جان کا تو مرکز ثقل صبح سے گڑبڑ ہو چکا تھا۔ انوری کو، جواب دینے کی تمنا اسے ضرور تھی۔ لیکن ہر دو نہ کھلا۔ بے چاری جب چاپ آگے نکل گئی۔

انوری نے حیرانی سے رشو کی طرف دیکھا۔ پھر چپڑا لاکھ جیسے سرخ ہونٹ پھٹپھٹاتے اور بھوئوں سے جھاڑن پھیرنے لگی۔

دوسرے دن جب رشو سائیکلوجی کی کلاس میں پہنچی تو ڈاکٹر اعجاز حسین لیکچر دے

رہے تھے۔ ڈاکٹر نے اسے جالی کے دروازے کے پاس ٹھٹھکے ہوئے پایا تو یکدم خاموش ہو گئے۔ جیب سے بڑا سا سفید رومال نکالا۔ ربڑ والے ہارن کی طرح بھوں کر کے رومال میں ناک صاف کی اور پھر ہاتھ کے اشارے سے اسے اندر بلایا۔

رشّو کے لئے دہلیز الانگنا اتنا ہی مشکل ہو گیا جیسے مہارانی سیتا سے رامچندر جی کی کھنچی ہوئی باؤنڈری لائن سے قدم آگے گزرنا۔

ساری کلاس کے طلبا اور طالبات بھر پور نظروں سے اسکی طرف دیکھ رہے تھے۔ . .

"آپ کیا چاہتی ہیں؟" ڈاکٹر اعجاز نے انگریزی میں سوال کیا۔

"جی۔ . . میں نے آج ہی داخلہ لیا ہے سائیکلوجی . . . میں۔" رشّو منہ میں منمنائی

"کیا؟" ڈاکٹر صاحب نے گردن کو ایک طرف موڑ کر پوچھا۔

"جی۔ میں بہاولپور سے آئی ہوں۔ ایم۔ اے سائیکلوجی کے لئے۔"

"پھر بیٹھ جائیے' باہر کیوں کھڑی ہیں آپ؟"

ساری کلاس یکبارگی ہنس دی۔ رشّو نے اسی میں عافیت جانی کہ سب سے پہلی کرسی پر جلدی سے تسلط جما لیا۔ بات کچھ بھی نہ تھی۔ وہ تازہ وارد تھی۔ لڑکے لڑکیاں اسے تجسس سے دیکھنے میں حق بجانب تھے۔ لیکن اس کی ٹانگیں کمزور پڑ رہی تھیں۔ اسکا سارا وجود برادے کی طرح بھر بھرا اور بے جان ہو گیا تھا۔

"میں کیا کہہ رہا تھا؟" پروفیسر صاحب نے کلاس سے سوال کیا۔